ڈاکٹر محمد رفیع الدین مرحوم

خودی اور تخلیق

ایک خط کی تخلیق کا عمل

جب کوئی شخص ایک خط لکھنے کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ وہ اپنے دل میں کہتا ہے کہ اس مضمون کا لکھا ہوا ایک خط سپرد ڈاک ہو جائے۔ اس کا یہی عزم اس کے خط کے لیے اس کا قولِ کُن ہے۔ اس قول کے وقت اس کے خط کا ایک ایک لفظ اس کے شعور کے اندر موجود ہوتا ہے اور وہ خط کی اسی ذہنی یا شعوری صورت کو ہی خارجی طور پر ظہور پذیر کرنے کے لیے قولِ کُن سے خطاب کرتا ہے تاہم جب تک خط اس کے ذہن میں ہی ہوتا ہے عملی طور پر یہ واضح نہیں ہوتا کہ اس کے الفاظ درحقیقت کیا ہیں۔ قولِ کن کے بعد تخلیق کی صورت میں زمان و مکان کے اندر خط کا بیرونی ظہور فوری نہیں ہوتا بلکہ تدریجی تکمیل یا تدریجی ارتقا کے ایک عمل کی صورت اختیار کرتا ہے۔ جب تک خط اس کے شعور میں ہوتا ہے اس وقت تک اگرچہ خط کے وہ الفاظ جن کا ارادہ وہ کر چکا ہوتا ہے اس کے سامنے نہیں آتے تاہم اس کے شعور میں موجود ہوتے ہیں اور پھر قولِ کُن سے اس کے شعور میں وہ الفاظ ہی وجود میں نہیں آتے جو درحقیقت اس کے مقصد سے مطابقت رکھتے ہیں اور لہٰذا درست اور زیبا اور اچھے ہوتے ہیں بلکہ وہ تمام الفاظ بھی جو اِس کے مقصد سے نزدیک یا دُور کی مطابقت کا کوئی امکان رکھ سکتے ہیں وجود میں آتے ہیں لیکن مقصود الفاظ کو غیر مقصود الفاظ سے ممیّز کرنے کا موقع اس وقت آتا ہے جب وہ خط لکھنے لگتا ہے کیونکہ اس وقت وہ ان الفاظ کو جو اس کے مقصد سے درحقیقت مطابقت نہیں رکھتے عملی طور پر جان لیتا ہے۔ لہٰذا یا تو لکھ کر کاٹ دیتا ہے یا بغیر لکھنے کے اپنے ذہن میں منسوخ کر دیتا ہے کیونکہ وہ اس کے مقصد کے اعتبار سے غلط اور ناخوب اور بُرے ہوتے ہیں۔ ترک و اختیار اور تنسیخ اور تثبیت کے اس عمل سے وہ درحقیقت اس صحیح مطلوب اور مقصود خط کی جستجو کرتا ہے جس کو اس نے

© rasailojaraid.com

قول کُن کہا تھا اور جو اس کے شعور میں شروع سے ہی موجود ہو گیا تھا۔ اس طرح سے خط کی تخلیق میں لکھنے والے کی تمام صفاتِ جلال و جمال اپنا اظہار پاتی ہیں۔ اگر درست الفاظ کی ترتیب اور تنظیم میں لکھنے والے کی صفاتِ جمال کام کرتی ہیں تو غلط الفاظ کی تردید اور تنسیخ میں اس کی صفاتِ جلال بروئے کار آتی ہیں۔ الغرض اس کا خط لکھنا کسی مقصود یا مطلوب کی ایسی جستجو کی صورت اختیار کرتا ہے جس کے ذریعے سے وہ اپنے آپ کا اظہار کرتا ہے اور اسی بنا پر وہ تخلیق یا آفریدن کا ایک عمل ہوتا ہے جس پر اقبال کی یہ تعریف صادق آتی ہے:

آفریدن جستجوئے دلبرے
وانمودن خویش را بر دیگرے

پھر جب تک خط اس کے ذہن میں ہوتا ہے وہ خط زمان و مکان کی دنیا میں نہیں ہوتا اور نہ ہی یہ بتایا جا سکتا ہے کہ خط کے مقصد کے اعتبار سے کون سے الفاظ درست ہیں اور کون سے نادرست، کون سے زیبا ہیں اور کون سے نازیبا اور کون سے اچھے ہیں اور کون سے بُرے لیکن جونہی وہ خط لکھنے لگتا ہے خط کا مضمون ایک ابتدا سے ایک انتہا کی طرف حرکت کرنے یا بتدریج ارتقا کرنے یا تکمیل پانے لگتا ہے اور ایسا کرتے ہوئے کاغذ پر کچھ فاصلہ طے کرتا ہے اور کچھ وقت صرف کرتا ہے۔ اس طرح خط کی تخلیق سے حرکت اور خط کے زمان و مکان وجود میں آتے ہیں پھر خط لکھنے والا اپنے مقصد سے جو کشش رکھتا ہے وہ خط کے تمام الفاظ کے اندر سرایت کر جاتی ہے اور ان کی باہمی کشش کی صورت اختیار کرتی ہے ان کو ایک دوسرے سے مربُوط کرتی ہے اور ان کے اندر ایک خاص ترتیب اور تنظیم اور تسلسل پیدا کرتی جاتی ہے۔ گویا خط جب خارج میں تخلیق کی صورت اختیار کرتا ہے تو کسی مطلوب یا مقصود کی محبّت اور جستجو، مقصود کے غلط اور ناقص متبادلات، حرکت، تدریجی ارتقا، خط کے زمان و مکان، الفاظ کی باہمی کشش، درست و نادرست اور خوب و ناخوب کا امتیاز اور لکھنے والے کی صفاتِ جلال و جمال کا اظہار خط کی تخلیق کے لوازمات کے طور پر نمودار ہوتے ہیں۔

کائنات کی تخلیق کا عمل

کائنات کی تخلیق کی صورت میں بھی تخلیق کے یہی لوازمات اظہار پاتے ہیں۔ خدا کے قولِ

کُن کے وقت کائنات اپنی پوری تفصیلات کے ساتھ خدا کے شعور میں موجود ہوگئی تھی۔ کائنات کی اس ذہنی یا شعوری حالت کو ہی خدا نے کُن کا حکم دیا تھا۔ کائنات کی ایسی حالت کو ہی قرآنِ حکیم نے لوحِ محفوظ یا اُمّ الکتاب کہا ہے۔ تاہم تخلیق کی صورت میں کائنات کا خارجی ظہور فی الفور نہیں ہوا بلکہ اس نے تدریجی ارتقا کے ایک عمل کی صورت اختیار کی ہے اور یہ عمل عرصہ دراز سے جاری ہے اور جب تک نوعِ انسانی اپنی تکمیل کی انتہا کو نہیں پہنچ جاتی برابر جاری رہے گا۔ تخلیق حسن کی جانب خودی کے ارادہ کی حرکت کا نام ہے۔ حرکت تخلیق کی اصل ہے جس کے بغیر تخلیق ممکن ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کائنات کی ہر چیز کی بنیاد حرکت ہے اور پُوری کائنات متحرک ہے:

فریبِ نظر ہے سکُون و ثبات
تڑپتا ہے ہر ذرّہ کائنات
ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجُود
کہ ہر لحظہ تازہ ہے شانِ وجُود

خودی یا زندگی کا راز اگر کوئی ہے تو یہی ہے کہ وہ اپنے مقصود کی طرف اُڑنے یعنی نہایت سُرعت کے ساتھ حرکت کرنے کا ایک ذوق ہے۔

سمجھتا ہے تو راز ہے زِندگی
فقط ذوقِ پرواز ہے زِندگی

جب تک کائنات فقط خدا کے شعور میں تھی وہ زمان و مکان میں نہیں تھی لیکن جب اس نے خارج میں تخلیق کی صورت اختیار کی اور اس کی حرکت وجود میں آئی تو اس حرکت کے ساتھ ہی زمان و مکان بھی وجُود میں آ گئے۔ کیونکہ حرکت کے معنی یہ ہیں کہ جو چیز حرکت کر رہی ہے وہ ایک ابتدا سے ایک انتہا کی طرف آگے بڑھ رہی ہے اور لہٰذا ایسا کرتے ہوئے کچھ وقت صرف کر رہی ہے اور کچھ فاصلہ طے کر رہی ہے۔ یعنی اس کی حرکت زمان و مکان میں ہے۔ پھر تخلیقِ کائنات کی ابتداء کے ساتھ ہی خوب و ناخوب اور زشت و زیبا اور حق و باطل کا امتیاز بھی نمودار ہوگیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خودی کی فطرت اس قسم کی ہے کہ وہ حُسن کو ضدِّ حُسن سے ممیّز کرتی ہے اور جب حُسن کے کسی تصوّر سے محبّت کرتی ہے تو اس کی ضد سے بیزار ہوتی ہے۔ محبّت کا تقاضا یہ ہے کہ محبوب سے قرب

© rasailojaraid.com

تلاش کیا جائے اور بیزاری کا تقاضا یہ ہے کہ محبت کی خاطر مرجعِ بیزاری کو دُور کیا جائے اور برباد کیا جائے۔ چونکہ خودی سراسر محبّت ہے اس کی تمام صفات فقط اس کی محبت کی خدمت اور اعانت کے لیے اور محبّت کے مقاصد کی تحصیل اور تکمیل کے لیے اظہار پاتی ہیں بلکہ یُوں کہنا چاہیئے کہ خودی کی جُملہ صفات اُس کی مرکزی صفتِ محبّت کے تقاضے یا شیوٗن یا کوائف ہیں اور ان صفات کی شکل میں خود محبّت ہی اپنی مختلف حالتوں اور موقعوں کا اظہار کرتی ہے۔

خدا کی تخلیق میں صفاتِ جمال و جلال کی کارفرمائی

تاہم کائناتی خودی کی بعض صفات ایسی ہیں کہ وہ براہِ راست اور بلا واسطہ محبّت کی خدمت اور اعانت کرتی ہیں مثلاً ربّ، حافظ، حفیظ، وکیل، رحمٰن، رحیم، مومن، مھیمن، غفّار، وہّاب، رزّاق، باسط، رافع، رقیب، مُعزّ، فتّاح وغیرہ ایسی صفات کو صفاتِ جمال کہا جاتا ہے اور بعض صفات ایسی ہیں کہ وہ بالواسطہ یعنی محبّت کے راستہ کی رکاوٹوں کو دُور کر کے محبّت کی خدمت اور اعانت کرتی ہیں مثلاً قہّار، مُذِلّ، منتقم، مانع، ضارّ وغیرہ ایسی صفات کو صفاتِ جلال کہا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خودی کی فطرت اس قسم کی ہے کہ اگر اس کی صفاتِ جمال اپنے اظہار کے لیے کسی ایسے تصورِ حُسن کا تقاضا کرتی ہیں جس کی تحصیل اور تکمیل کے لیے وہ اپنی تخلیقی اور تربیتی کارروائی کرے تو اس کی صفاتِ جلال اپنے اظہار کے لیے ایسے ضدِ حُسن تصوّرات کا تقاضا کرتی ہیں جنہیں وہ اپنے آپ کا مخالف اور غیر سمجھے اور اپنے تصورِ حُسن کی تخلیق اور تکمیل کی خاطر اپنے راستہ سے ہٹائے اور برباد کرے لہٰذا وہ حُسن کے ساتھ ضدِ حسن بھی پیدا کرتی ہے اور ضدِ حسن سے اس کی بیزاری محبّتِ حسن کے تابع رہتی ہے۔ کائنات کی تخلیق کے اندر قدم قدم پر جدّ وجہد اور کش مکش اور پیکار کا باعث یہی حقیقت ہے۔ اقبال اس حقیقت کا ذکر اس طرح سے کرتا ہے:

سازد از خود پیکرِ اغیار را — تا فزاید لذتِ پیکار را
مے شود از بہرِ اغراضِ عمل — عامل و معمول و اسباب و علل

انسان کی تخلیق میں صفاتِ جلال و جمال کا عمل

اگر ہم اپنے آپ پر غور کریں تو یہ حقیقت اور واضح ہو جاتی ہے۔ جب ہم کسی کام کو انجام دینے کا ارادہ کرتے ہیں تو اس کے بہت سے امکانات ہمارے ذہن میں آتے ہیں لیکن جب ہم فی الواقع وہ کام کرنے لگتے ہیں تو ہم صرف ایک امکان کو جو ہمارے مقصود سے درحقیقت مطابقت رکھتا ہے خوب اور حق اور زیبا سمجھ کر چن لیتے ہیں اور باقی تمام امکانات کو جو دراصل خُوب اور ناخوب اور حق اور باطل اور زشت اور زیبا کا ممتزج یا مرکب ہوتے ہیں ناخوب اور باطل اور زشت سمجھ کر رد کر دیتے ہیں۔ کیونکہ وہ ہمارے مقصود سے پوری پوری مطابقت نہیں رکھتے۔ جو امکان حق اور خوب اور زیبا ہوتا ہے وہ صرف ایک ہی ہوتا ہے لیکن باطل اور ناخوب اور زشت امکانات جو حق و باطل کی شرکت سے بنتے ہیں بہت سے ہوتے ہیں۔

باطل دوئی پسند ہے حق لا شریک ہے
شرکت میانہ حق و باطل نہ کر قبول!

عملِ ارتقا میں تخریب اور تبذیر کی حکمت

خدا کی تخلیق کی صورت میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ خدا کا کسی امکان کو سوچنا اس کو پیدا کر دیتا ہے۔ خدا پہلے اپنی پسندیدہ تخلیق کے تمام امکانات کو عمل میں لاتا ہے اور پھر اُس ایک امکان کو چن لیتا ہے جو تخلیق کی صورت اختیار کرنے کے بعد یعنی عملی طور پر اس مقصد کے مطابق اور لہٰذا خوب اور حق اور زیبا ثابت ہوتا ہے اور باقی امکانات کو یا تو صفحۂ ہستی سے بالکل مٹا دیتا ہے یا نظر انداز کر دیتا ہے۔ جس کے نتیجہ کے طور پر وہ جس حالت کو پہنچ جاتے ہیں اسی پر قائم رہتے ہیں اور مزید ترقی نہیں کر سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ کائنات کے اِرتقا کے دَوران مادّی، حیاتیاتی اور انسانی سطحِ ارتقا پر ایسی مخلوقات بھی وجود میں آتی رہی ہیں جو خُدا کے نصب العین یعنی انسانیتِ کاملہ کی تخلیق سے براہِ راست کوئی تعلق نہ رکھتی تھیں اور فقط تخلیق کے اصل مرکزی سلسلہ کی ضمنی یا اتفاقی پیداوار تھیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ خودی ایسی مخلوقات کو یا تو مٹا دیتی رہی یا

© rasailojaraid.com

ایک ہی حالت پر موجود رہنے کے لیے چھوڑ دیتی رہی۔ مثلاً خودی نے لاکھوں نظام ہائے شمسی پیدا کیے لیکن بظاہر صرف ایک نظامِ شمسی اس کے مقصد کے مطابق تھا۔ یعنی وہ جس کے ایک زمین نامی سیارہ میں زندگی نمودار ہو کر نشو و نما پا رہی ہے۔ اُس نے لاکھوں گلشنوں کو پیدا کیا ہو گا۔ لیکن اس کا مقصود صرف چند خوبصورت پھول تھے جن کی اقسام نباتاتی عملِ ارتقا میں باقی رہ گئی ہیں۔ اُس نے قدرت میں سینکڑوں ناخوشگوار آوازیں پیدا کی ہونگی، تب جا کر اسے چند خوش گلو پرندوں کے دلآویز نغمے میسّر آئے ہیں۔ اُس نے ہزاروں انبیاء پیدا کیے لیکن صرف حضرت محمّد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم ہی کو تعلیمِ نبوّت کے کمال پر پہنچایا اور مؤثر حالت میں باقی رکھا۔ اس طرح سے یہ بات اس کی فطرت میں ہے کہ وہ اقبال کے الفاظ میں گویا اپنے آپ کو فریب دیدے کر اپنے مقصود کو حاصل کرتی ہے۔ بعض لوگ اُسے قدرت کا قہر یا اسراف سمجھتے ہیں لیکن درحقیقت خودی کا یہ کام اس کی فطرت کے عین مطابق ہے اگر خودی ایسا نہ کرے تو وہ خودی نہ ہو۔ خودی جو چیز پیدا کرنا چاہتی ہے وہ فی الفور پیدا نہیں کرتی بلکہ قدرت اور اختیار کے باوجود اپنے آپ پر لازم کرتی ہے کہ پہلے بہت سے ناکام تجربات کرتی اور اپنی نامکمل تخلیقات کا خون کرتی رہے لیکن آخرکار اس کی تخلیق اس کمال کو پہنچتی ہے جو اس کا مقصود ہوتا ہے۔ اس ظاہری قہر اور اسراف کے بغیر جمالِ معنوی کی تخلیق اور تکمیل ممکن نہیں ہوتی۔ خودی کی صفات کے مطابق حُسن کی تخلیق اور تکمیل کے لیے غیرِ حُسن کی تخلیق اور تباہی ضروری ہے۔ علّامہ اقبال اس حقیقت کا اظہار کرتے ہوتے لکھتے ہیں:

خود فریبی ہائے او عینِ حیات ہمچو گل در خوں وضو عینِ حیات
بہرِ یک گل خونِ صد گلشن کُند از پئے یک نغمہ صد شیون کُند
شعلہ ہائے او صد ابراہیم سوخت تا چراغِ یک محمّدؐ بر فروخت
عذرِ ایں اسراف وایں سنگیں دلی خلق و تکمیلِ جمالِ معنوی،
صد نیستاں کاشت تا یک نالہ رست صد چمن خوں کرد تا یک لالہ رست
نقشہا آورد و افگند و شکست تا بلوحِ زندگی نقشِ تو بست
نالہ ہا در کشتِ جاں کاریدہ است تا نوائے یک اذاں بالیدہ است
مدّتے پیکار با احرار داشت با خداوندانِ باطل کار داشت

تخمِ ایماں آذر اندر گِل نشاند   با زبانت کلمۂ توحید خواند

ترک واختیار تخلیق کے لوازمات ہیں

ترک اور اختیار کے اسی عمل کی وجہ سے جو تخلیق کو لازم ہے اور جس کا دارومدار محبّت پر ہے اقبال تخلیق کو کسی محبوب کی جستجو سے تعبیر کرتا ہے۔ ؏

آفریدن جستجوئے دلبرے
وانمودن خویش را بر دیگرے

تخلیق وتکمیلِ کائنات کی غرض سے ترک واختیار کے اس عمل کا ذکر قرآن حکیم میں ہے:

یَمْحُوا اللّٰہُ مَا یَشَاءُ وَیُثْبِتُ وَعِنْدَہٗ اُمُّ الْکِتٰبِ (۱۳:۴۱)

(خدا اپنی تخلیق میں سے جس چیز کو چاہتا ہے مٹاتا ہے اور جس چیز کو چاہتا ہے قائم رکھتا ہے اور اس کے پاس اُمّ الکتاب یا لوح محفوظ ہے جس میں یہ بات طے شدہ موجود ہے کہ کیا چیز مٹائی جائے گی اور کیا چیز باقی رکھی جائے گی)

اسی موضوع پر ایک اور جگہ قرآن کا ارشاد ہے:

وَرَبُّکَ یَخْلُقُ مَا یَشَاءُ وَیَخْتَارُ مَا کَانَ لَھُمُ الْخِیَرَۃُ
سُبْحٰنَ اللّٰہِ وَتَعَالٰی عَمَّا یُشْرِکُوْنَ۔ (۲۸:۶۸)

(اور تمہارا ربّ جس چیز کو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور پھر اپنی پیدا کی ہوئی چیزوں میں سے جس چیز کو چاہتا ہے مزید ترقی دے کر درجۂ کمال پر پہنچانے کے لیے چُن لیتا ہے لیکن ایسا چناؤ ان لوگوں کے بس میں نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو معاذاللہ انسان خدا کا شریک ٹھہرتا لیکن خدا پاک ہے اور بلند ہے ہر اس چیز سے جسے یہ لوگ اس کا شریک ٹھہراتے ہیں)

© rasailojaraid.com

قبولِ حق کے لیے ترکِ باطل ضروری ہے

خودی جب اپنے نصب العین کی آرزو کی عملی تشفی اور تسکین کرنے لگتی ہے تو اسے معاً معلوم ہونے لگ جاتا ہے کہ کون کون سی چیزیں ہیں جو اس کے نصب العین کی نقیض ہیں اور جن کی آرزو وہ نہیں کر رہی اور جن کا وجود اس کی آرزو کے راستہ میں رکاوٹ ہے۔ باطل باہر سے نہیں آتا بلکہ حق کے ساتھ ہی اس کے نقیض کے طور پر خود بخود نمودار ہو جاتا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے کہ جب ہم ایک سمت میں آگے بڑھ رہے ہوں تو ضروری ہوتا ہے کہ ہم اس کی مخالف سمت کو پیچھے چھوڑتے جائیں۔ حرکت کی فطرت میں ہے کہ اس سے بیک وقت دو سمتیں نمودار ہوتی ہیں، ایک موافق اور دوسری مخالف تخلیق بھی ایک قسم کی حرکت ہے اور اس سے بھی دو سمتیں پیدا ہوتی ہیں، ایک موافق اور دوسری مخالف۔ خودی کے لیے نصب العین کی سمت حق ہے اور نصب العین کے خلاف کی سمت باطل ہے۔ جب خودی نصب العین کی طرف ایک قدم آگے بڑھتی ہے تو غیر نصب العین کو جو اس کے نقیض کے طور پر پاس ہی موجود ہوتا ہے، ایک قدم پیچھے چھوڑ جاتی ہے۔ حق کے قبول کو باطل کا ترک لازم آتا ہے اور جس حد تک ہم حق کو قبول نہیں کرتے ہم باطل کو قبول کرتے ہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم حق کو قبول کریں اور باطل کو معاً ترک نہ کریں یا باطل کو قبول کریں اور حق کو معاً ترک نہ کریں۔ روشنی کا تصور تاریکی کے بغیر، سچ کا جھوٹ کے بغیر، انصاف کا ظلم کے بغیر اور حق کا باطل کے بغیر ممکن نہیں۔ جو شخص سچ انصاف اور حق سے محبت کرتا ہے ضروری ہے کہ وہ جھوٹ ظلم اور باطل سے نفرت کرے۔ اسی طرح سے سچائی، انصاف اور حق کی اعانت جھوٹ، ظلم اور باطل کی مخالفت کے بغیر ممکن نہیں۔ خودی کے تخلیقی عمل کے ہر قدم پر جس طرح سے حق یا حسن ایک نئی شان سے جلوہ گر ہوتا ہے اسی طرح سے باطل بھی ایک نئی صورت میں اس کے سامنے آتا ہے اور حق یا حسن کی اس شان سے ہمکنار ہونے کے لیے باطل کی اس نئی صورت کو فنا کرنا خودی کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ ابلیس باطل کی قوتوں پر مسلّط ہے۔ خودی کے لیے ضروری ہے کہ ان قوتوں سے کسی حالت میں بھی صلح نہ کرے بلکہ ان کے بالمقابل اپنی جلالی صفات کا مظاہرہ کرے اور ان کے ساتھ پوری قوت سے نبرد آزما ہو کر ان کو راستہ سے ہٹا دے۔ ورنہ اس کی ترقی اور تکمیل خطرہ میں

d.com

پڑ جائے گی:

بزم با دیو است آدم را وبال!
رزم با دیو است آدم را کمال!

جلال کی تائید کے بغیر جمال بے اثر اور بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے کیونکہ وہ غیر محفوظ اور غیر مکمل سمجھا جاتا ہے۔ جمال کا کمال یہی ہے کہ وہ جلال کے ساتھ ہو ورنہ وہ ناقص ہے اور نقص حُسن کا نقیض ہے۔

نہ ہو جلال تو حُسن و جمال بے تاثیر
نرا نفس ہے اگر نغمہ ہو نہ آتشناک!
مجھے سزا کے لیے بھی نہیں قبول وہ آگ
کہ جس کا شعلہ نہ ہو تند و سرکش و بیباک

نغمہ حسین اور دلکش ہوتا ہے لیکن اگر وہ آتشناک نہ ہو یعنی غیر حسن کو جلا دینے اور برباد کرنے کی طرف راغب کرنے کا پہلو نہ رکھتا ہو تو وہ فقط ایک سانس ہے۔ یا سانس سے مرتب ہونے والی ایک آواز۔ آگ میں حُسن ہے کیونکہ وہ ایک نور ہے لیکن اگر سزا کے طور پر آگ میں جلنے کا بھی مزا ہو سکتا ہے تو یقیناً وہ اُس آگ میں نہیں ہو سکتا جس کا شعلہ تندی سرکشی اور بے باکی کی جلالی صفات سے عاری ہو۔

تخریب تعمیر کے لیے ناگزیر ہے

چونکہ کائنات کی تخلیق میں خدا کی صفاتِ جلال و جمال دونوں اپنا کام کر رہی ہیں۔ کائنات میں ربوبیت یا تعمیر اور استیصال یا تخریب بھی دونوں ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو کارفرما ہیں تخریب تعمیر کی اغراض کے ماتحت اور اس کو کامیابی کی منزل تک پہنچانے کے لیے عمل میں آتی ہے لہٰذا کائنات کی تعمیر کی طرح تخریب بھی خدا کی محبت اور رحمت اور ربوبیت کی مظہر ہے اور خدا کی صفاتِ جلالی بھی ویسی ہی قابلِ ستائش ہیں جیسی کہ صفاتِ جمالی۔ قرآنِ حکیم میں ایک مقام پر ارشاد ہے کہ جو قوم خدا کے نشانات کو جھٹلایا کرتی تھی۔ خدا نے اسے تباہ کر دیا اور جڑ سے اکھاڑ کر رکھ دیا اور پھر

© rasailojaraid.com

اس کے بعد آیت کا تتمہ ہے کہ سب ستائش اللہ کے لیے ہے جو اہلِ جہان کا رَبّ ہے۔ اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ اس قوم کی ہلاکت بھی خدا کی محبّت اور رحمت اور ربوبیّت کا مظہر تھی اور یہ وہ صفات ہیں جن کی وجہ سے خدا ستائش کے لائق ہے اس لیے کہ اگر یہ قوم تباہ نہ ہوتی تو تخلیقِ حُسن کے راستہ میں بدستور ایک رکاوٹ بنی رہتی اور پھر کائنات کی ربوبیّت اپنے کمال کو نہ پہنچ سکتی۔

فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔

(اور ان لوگوں کی جڑ کاٹ دی گئی جنہوں نے ظلم کی روش اختیار کی تھی اور سب ستائش اللہ کے لیے ہے جو اہلِ جہان کا رَبّ ہے۔)

ایک باغبان اپنے باغ کے حُسن کو قائم رکھنے کے لیے ضروری سمجھتا ہے کہ درختوں کے نیچے اور کیاریوں میں سے ایسے پودوں کو اکھاڑ کر باہر پھینک دے جو اس کے مقصد کے مطابق نہیں اور غیر ضروری ہونے کے علاوہ ان پودوں اور درختوں کی کھاد اور نمی کو جذب کر لیتے ہیں جن پر باغ کے حُسن کا دارومدار ہے۔ اس کے لیے درانتی کو استعمال کرنا اتنا ہی ضروری ہوتا ہے جتنا کہ پودوں کو کھاد اور پانی مہیا کرنا۔ اس کے تخریبی کام کے بغیر اس کا تعمیری کام بارآور نہیں ہو سکتا لہٰذا اس کا تخریبی کام بھی قابلِ ستائش ہے۔ اس نکتہ کو سمجھانے کے لیے مولانا روم ایک درزی کی مثال دیتے ہیں۔

جب ایک درزی کوٹ تیار کرنے لگتا ہے تو کپڑے کو بہت سے ٹکڑوں میں کاٹ دیتا ہے اور پھر بعض ٹکڑوں کو چُن لیتا ہے اور بعض کو بیکار سمجھ کر رَدّ کر دیتا ہے۔ اسے بجا طور پر کوئی نہیں پوچھتا کہ تم نے کپڑے کے ایک حصّے کو کیوں ضائع کر دیا ہے۔

(جاری ہے)